'حکایات پنجاب' چند نئے مباحث

*ڈاکٹر سعید بھٹا

رچرڈ کارنیک ٹمپل (1850-1931) الہ آباد میں پیدا ہوا جہاں اس کا والد سر رچرڈ ٹمپل ایسٹ انڈیا کمپنی کا انتظامی آفیسر تھا۔ وہ کیمبرج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انڈین آرمی میں ملازم ہو گیا بعد ازاں اس کا تقرر 'کنٹونمنٹ مجسٹریٹ' کے طور پر پنجاب میں کیا گیا۔ برما سے جنگ کے دوران اُسے رنگون بھیج دیا گیا۔ وہ بنگال آرمی میں بھی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے چیف کمشنر بنایا گیا۔ وہ 1904ء میں ریٹائر ہوا اور اس نے 1931ء میں وفات پائی۔(1) ٹمپل کو آرمی آفیسر اور بیوروکریٹ کی مصروفیات کے باوجود تاریخ، انسانیات، نسلیات اور لوک ادب سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس نے ان موضوعات پر کئی مقالے لکھے۔ وہ ''پنجاب نوٹس اینڈ کوئیرز'' 87-1883 کا مدیر بھی رہا۔ اس نے ''دی لیجنڈز آف دی پنجاب''، تین جلدوں میں مرتب کی۔ 'لیجنڈز' کی پہلی جلد 1884ء، دوسری جلد 1885ء اور تیسری جلد 1900ء میں شائع ہوئی۔ ان تین جلدوں کا اردو ترجمہ میاں عبدالرشید نے 'حکایات پنجاب' کے زیرعنوان کیا جسے مجلسِ ترقی ادب لاہور نے شائع کیا۔(2) 'دی لیجنڈز آف دی پنجاب' کے حوالے سے لکھا ہے:

> "Among them, two men were primarily responsible for leading the study of Indian Folklore into international academic circles. One was William Crooke whose two-volume study of folklore in North India (Crook1894) is still unmatched in scope and depth. The other was

*ایسوسی ایٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی لاہور

R.C.Temple who published three volumes of legends from the Punjab (Temple 1884-1900) that set high standards. Temple collected oral texts, published the (transliterated) originals, and included an exhaustive description and imaginative classification of their motifs." (3)

یورپین اقوام نے تو سولہویں صدی میں ہی ہندوستان کا رُخ کر لیا تھا اور گوا کے مقام پر پہلا پریس 1556ء میں قائم ہو گیا تھا۔(4) سولہویں صدی سے اُنیسویں صدی کے پہلے نصف تک مقامی زبانوں کو سیکھنا، گرامر، لُغات، لوک ادب، سفر نامے، مذاہب کا مطالعہ، سنسکرت اور فارسی کی طرف مستشرقین کی توجہ رہی۔ جہاں تک لوک کہانیوں کی تحقیق کا تعلق ہے تو ڈاکٹر مظہر الاسلام نے انگریز مستشرقین کی برعظیم میں تحقیق کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور 1878-1838ء، دوسرا دور 1920-1878ء اور تیسرا دور 1947-1920ء تک کا ہے۔(5) ٹمپل دوسرے دور کا اہم محقق ہے۔ اسی عہد میں لندن میں فوک لور سوسائٹی کا قیام اور فوک لور جرنل کی اشاعت شروع ہو چکی تھی۔ اس عہد کے اہم محققین سوسائٹی کے ممبر اور جرنل کی ادارت میں شامل تھے۔

"Under the leadership of the scholars mentioned, who were later joined by E.Sydney Hartland, Edward Clodd and James George Frazer, a new scholarship in the study of folklore gradually developed, This group again was enlarged later on by the active participation of men like Richard Carnac Temple, Longworth Dames, William Crooke, and John shakespear, all of whom had spent many years in India as administrators."(6)

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز مستشرقین کی تحقیق کا رخ ہی بدل گیا۔ اب عام آدمی کو کنٹرول میں رکھنے کے نسخے تجویز کئے گئے۔ اس ضمن میں مردم شماری کی رپورٹیں اور لوک ادب کی نئے زاویوں سے تحقیق خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے۔ مردم شماری کی رپورٹ میں مذہب اور ذات کا خانہ بھی شامل کیا گیا۔ برعظیم جو کئی مذاہب کا خطہ ہے اس میں رپورٹ کے ذریعے عوام میں پھوٹ ڈالنے کا کام لیا گیا۔ بعد ازاں

ووٹ کے ذریعہ متوقع نتائج ہی برآمد ہوئے۔ ذات سے نسلی اختلاف پروان چڑھے اور اس سے یہ تاثر پیدا کیا گیا کہ برعظیم مختلف قبائل کا مجموعہ ہے اور 'ہندوستانی' کوئی قوم نہیں۔ اس دور میں انگریز آفیسروں کو خصوصی ہدایات کی گئیں کہ ضرب الامثال مرتب کی جائیں۔ انگریز آفیسر عدالتوں میں ایسی کہاوتیں دہراتے جن سے مقامی قبائل کے منفی کردار کی عکاسی ہوتی تا کہ ان کا احساس کمتری مزید پختہ ہو کہ ان کی اپنی دانش بھی ان کے بارے میں یہی کچھ کہتی ہے۔ یہ رپورٹیں ہندوستان کے تمام صوبوں میں مرتب کروائی گئیں۔ پنجاب میں یہ فریضہ ڈینزل ابٹسن نے سرانجام دیا۔

پنجاب میں 'کولونیل نالج' کے حوالے سے ڈینزل ابٹسن اور آر۔سی۔ٹمپل کی تحقیق کی بنیادی اہمیت ہے۔ٹمپل کا مقصد بھی مقامی مزاج سے آشنائی اور پنجاب باسیوں کی نفسیات اور احساسات کی تہہ تک پہنچنا تھا تا کہ انتظامی افسران کو معاملت میں آسانی رہے۔ رہیجا نے آر۔سی۔ٹمپل کے حوالے سے لکھا ہے:

> The practices and beliefs included under the general head of folk-lore make up the daily life of the natives of our great dependency, control their feelings, and underlie many of their actions. We foreigners cannot hope to unerstand them rightly unless we deeply study them, and it must be rememberd that close acquaintance and a right understanding begets sympathy, and sympathy begets good government."(7)

محولہ بالا اقتباس کے بعد کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ لوک ادب کے متعلق تحقیق کے مقاصد عوامی احساسات کو سمجھ کر کنٹرول کرنا تھا تا کہ انگریزی راج طویل عرصہ تک اس خطے میں قائم رہ سکے۔

آر۔سی۔ٹمپل آرمی آفیسر اور بیوروکریٹ تھا۔ اس کے لیے لوک کہانیاں اکٹھی کرنے کی تمام تر سہولیات موجود تھیں۔ اس نے آغاز میں فیلڈ ریسرچ کرنے کی کوشش کی لیکن اسے جلد ہی اس کام کی مشکلات کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے بہت سی کہانیاں اپنی 'نگرانی' میں تیار کروائیں لیکن چند تو اسے لکھی لکھائی بھی مل گئیں۔

''ان کہانیوں کے مسودے میرے پاس مقامی زبانوں میں پہنچائے گئے، انہیں مقامی

لوگوں نے ہی قلم بند کیا تھا اور میرے پاس یہ باور کرنے کے لیے وجوہ موجود ہیں کہ یہ کہانیاں درست طور سے قلم بند کی گئی ہیں''۔(8)

ٹمپل کو جو کہانیاں لکھی ہوئی ملی تھیں وہ ان کے بارے میں تیقن سے کہتا ہے کہ یہ درست ہیں لیکن ان 'وجوہ' کی وضاحت نہیں کرتا کہ اس نے انہیں کس پیمانے پر ناپ کر درست مان لیا ہے۔ٹمپل دوسری کہانیوں کے بارے اپنے تحقیقی طریق کار کے متعلق لکھتا ہے:

''ظاہر ہے کہ یہ طریق کار بہت کٹھن ہے اور اس کے لیے بہت سا وقت درکار ہے اور میرے جیسا سرکاری ملازم اتنا وقت کبھی بھی نہیں نکال سکتا، اس لیے بعد میں مجھے اس طریق میں تبدیلی کرنا پڑی۔ میں نے اپنے منشیوں کو نہایت احتیاط سے اس کام کی تربیت دی''۔(9)

یہ کہانیاں منشی ہی قلم بند کرتے۔'مُنشی' سے مُراد ہندوستان کے پروفیسر اور باؤ ہیں جو انگریزی تعلیم حاصل کر کے دفتروں میں کلرک لگ گئے تھے۔'انگریز بہادر' کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا جو اعزاز انہیں حاصل تھا یقیناً انہیں ہم عصروں سے ممیّز کرتا ہوگا۔'انگریز بہادر' کے لیے تحقیق کرنے والے دیسی لوگ بھی پنجابی نہیں تھے۔ٹمپل ان مُنشیوں کے متعلق رقمطراز ہے:

''کچھ تو یہ کام ویسے ہی مشکل تھا اور کچھ یہ دقت تھی کہ یہاں کے پڑھے لکھے لوگ جاہل گنواروں کی زبان کو ناپسند کرتے اور جہاں تک ہو سکے اسے تحریر میں لانے سے گریز کرتے تھے''۔(10)

'یہاں کے پڑھے لکھے لوگ' سے مراد وہی حضرات ہیں جو کمپنی بہادر کے کندھوں پر سوار ہو کر یہاں آئے تھے۔'صاحبی' انگریز بہادر کے پاس تھی اور 'کلرکی' کے وارث یہ ٹھہرے۔ پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد پنجابیوں سے یہ امتیازی سلوک برتا گیا کہ انہیں مادری زبان میں تعلیم کا حق نہیں دیا گیا۔ابھی تک پنجاب میں انگریزی کے ادارے بھی زیادہ نہیں کُھلے تھے کہ وہاں سے تعلیم حاصل کر کے پنجابی سرکاری ملازمتیں حاصل کر سکتے۔'جاہل گنواروں کی زبان' کو ناپسند کرنے والے پنجابی پر کتنی دسترس رکھتے ہوں گے۔ الہ آباد میں پیدا ہونے والے ٹمپل نے جگہ جگہ 'جاہل' اور 'اُجڈ' لوگوں کی زبان کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہی رویہ اس کے مُنشیوں کا بھی تھا، جن کی 'تربیت' کر کے اس نے تحقیق کروائی تھی۔ اس سے یہ عیاں ہے کہ 'نگران' اور منشیوں

دونوں کا رویہ اپنے موضوع کے متعلق حقارت آمیز تھا اور یہ دونوں دیسی زبان سے نابلد تھے۔ٹمپل نے اپنی تحقیق کی صحت اور مستند ہونے کے جو دعوے کئے ہیں، وہ زبان سے ناواقفیت کی بنیاد پر تو مشکوک ہی لگتے ہیں۔

ٹمپل نے جن داستان گوؤں سے کہانیاں سُن کر اکٹھی کی ہیں ان کے بارے میں بھی اس کا رویہ ناشائستہ ہے۔ وہ انہیں افیونی، تمباکو کے رسیا، لالچی وغیرہ کے القابات سے نوازتا ہے۔(11) اس نے ''حکایات پنجاب'' کی تینوں جلدوں میں انگریز آفیسروں، چند مقامی زمینداروں اور منشیوں کا تو نام لکھ کر شکریہ ادا کیا ہے لیکن یہ کہانیاں جن داستان گوؤں سے اکٹھی کر کے شائع کروائیں اور بعض علمی حلقوں کے مطابق لوک ادب کی عالمی تحقیق میں اہم اضافہ کا سبب بنیں، اُن کا نام تک لینا گوارا نہیں کیا۔ راقم الحروف نے پنجابی لوک کہانیوں کے موضوع پر فیلڈ ریسرچ کی ہے۔ یہ داستان گو اپنے معاشرے میں اب بھی میاں، میر اور قریشی وغیرہ کے القاب سے پہچانے جاتے ہیں۔جنہیں داستاں گوئی کے فن پر مہارت حاصل ہے وہ عوام و خواص میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ٹمپل کو اس چیز کا احساس تھا کہ بھاٹ جو اعلیٰ پیشہ وارانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں اور انہیں کئی لمبی نظمیں ازبر ہوتی ہیں یہ لوگ آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔

> ''دوسری طرف اگرچہ لوک گیت ابھی تک ختم نہیں ہوئے مگر انہیں سنانے والے بھاٹ آہستہ آہستہ مگر یقیناً ختم ہو رہے ہیں۔ انہوں نے ابھی سے شہروں کو چھوڑ کر دیہات کا رُخ کر لیا ہے۔ ریاست پٹیالہ کے صدر مقام پٹیالے میں مجھے تلاش بسیار کے باوجود کوئی بھاٹ نہ مل سکا۔ اس سے پہلے امراء اور سردار انہیں اکثر اپنے ہاں مدعو کرتے تھے بلکہ انہیں باقاعدہ وظائف بھی دیتے تھے، مگر اب وہ ان سے تعلق رکھنے میں عار محسوس کرتے ہیں''۔(12)

دراصل یہ بھاٹ اس خطہ کے زبانی مورخ تھے اور ریاستوں کے دیسی سربراہوں اور زمینداروں سے وظائف اور انعام واکرام اب نہ ملنے کی وجہ 'انگریز بہادر' ٹمپل سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ پنجابی معاشرے اور ثقافت میں یہ مغائرت زبان کی وجہ سے پیدا کی گئی۔ جس شناخت کو بھاٹ بڑھاوا دیتے تھے اب تو وہ پہچان بھی 'اُجڈ'، 'جاہل' اور 'گنوار' بن گئی تھی Sadhana Naithani کے مطابق:

"Temple cleverly avoids saying that the British presence and politics in India is displacing the bards "Former days" means pre-British days, and "native chiefs and nobles" are Indian rulers who, dethorned by the British army and intrigue, subsequently try to distance themselves from the local people and get near the new rulers. That these nobles and chiefs had lost the resources to be patrons of art and culture was a common phenomenon in nineteenth-century India, one that led to the degeneration and even disappearance of many literary and artistic traditions."(13)

انگریزی دربار تک رسائی کی خواہش میں آلودہ زمیندار اور نیا اشرافیہ بھی اب کسی اور شناخت پر اترانے لگا تھا۔ اس لئے زمیندار اور بھاٹ دونوں کا ایک دوسرے سے تعلق میں 'عار' محسوس کرنا، اسی نئے کلچر کی عطا تھی۔

ٹمپل اپنے تحقیقی ذرائع کی مذمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا بلکہ بے جا تنقیص پر بھی اُتر آتا ہے۔ وہ بھاٹ کے متعلق لکھتا ہے:

''جب وہ اشعار سُنا لیتا، اس کے بعد میں اسے لکھا ہوا مسودہ سناتا اور اس وقت اس سے ان الفاظ یا عبارتوں کے مطالب پوچھتا جو مبہم اور بے معنی نظر آتے، مگر یہ لوگ اس معاملے میں زیادہ مدد دینے سے قاصر ہوتے ہیں کیونکہ عام طور سے یہ جاہل اور کم عقل ہوتے ہیں جنہوں نے صرف ان گیتوں کو رٹ لیا ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ ان سے بعض متروک الفاظ کے قدیم معنی معلوم ہو سکتے ہیں''۔(14)

اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف میں جب ٹمپل ان کہانیوں کی کھوج کر رہا تھا تو بھاٹوں، میراثیوں کے حافظہ میں محفوظ قبل مسیح کے کرداروں کے متعلق بھی اس نے کہانیاں قلم بند کیں۔ اس تحقیقی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو کام ٹمپل کے کرنے کا تھا، اس کا تقاضا بھی داستان گو سے کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ

ٹمپل اور اس کے منشی تو اس زبان و ادب سے گہری واقفیت نہیں رکھتے ایسی صورت میں فلالوجسٹ کی ذمہ داری بھی اگر بھاٹ نہیں نبھا تا تو 'جاہل' اور 'کم عقل' تو ہونا ہی تھا۔ ٹمپل اس طرح کے جملوں سے یہ تاثر چھوڑنا چاہتا ہے کہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف تک پنجاب ایک 'اورل سوسائٹی' تھی اور ان روایات کے امین لوگ انتہائی پست تھے۔ اس کے بیانات کے اندر ہی تضادات موجود ہیں۔

''اگر وہ کوئی پڑھا لکھا شخص ہوتا جس نے سوانگ بھرا تھا تو میں اس سے اس کا مسودہ عاریتاً مانگ لیتا''۔(15)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ پڑھے لکھے بھی ہوتے تھے اور ان کے پاس قلمی نسخوں کی صورت میں بھی مسودات ہوتے۔ قبل ازیں ہم ٹمپل کے حوالے سے لکھ چکے ہیں کہ مقامی لوگوں نے اسے کہانیاں لکھ کر دی تھیں جن کے درست ہونے کے لیے وہ بے جا اصرار کرتا ہے۔ انیسویں صدی تک کا برعظیم دنیا میں علمی حوالے سے ممیّز تھا کہ اس خطے میں تین کلاسکی زبانوں سنسکرت، عربی، اور فارسی کی سکالرشپ موجود تھی۔ خوش نویسی اور کتابت کا ذوق ان علماء کی شخصیات کا حصہ تھا۔ تہذیبی مراکز کے ساتھ ساتھ عام دیہات میں کاتب موجود تھے جو علماء سے علمی کتب مستعار لے کر ان کی نقلیں تیار کر لیتے تھے۔ پیشہ ورانہ کتابت کا کام عروج پر تھا۔ سنسکرت، عربی اور فارسی میں خصوصاً اور مقامی زبانوں میں عموماً قلمی نسخوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اسی علمی ورثہ کو لوٹ کر انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم لائبریری سجائی گئیں۔ مستشرقین اس احساس جرم کو چھپانے کے لیے کالونیوں میں پرنٹنگ پریس کے نہ ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور اس طرح کے اعتراضات کر کے اہلِ ہند کو ان پڑھ کہنے کا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ہمارے ادعا پسند بھی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر یہی راگ الاپنے لگ جاتے ہیں۔

'حکایات پنجاب' کی تین جلدوں میں اُنسٹھ کہانیاں شامل ہیں۔ اس نے ایسی کہانیاں منتخب کی ہیں جن میں توہم پرستی، بدقسمتی، شگون، پیش گوئیاں، طلسماتی دُنیا، اولیاء کی کرامات، انسانوں کا شکلیں تبدیل کرنا، ستی، تہمت زدہ بچے، غیر مشروط وفاداری، جادو، ٹونے ٹوٹکے، فوق الفطرت عناصر، راکھشس، شیاطین، دیو، جن، بھوت، سانپ، جل پریاں، ضرر رساں ہیروئنیں، کُٹنیاں، سوئمبر، تقدیر پرستی، خودکشی وغیرہ جیسے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ٹمپل نے ان کہانیوں کے تجزیہ میں برعظیم کو غیر متمدن، غیر مہذب اور انسانی تاریخ کے ابتدائی دور کا معاشرہ ثابت کیا ہے جو زمانہ کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکا۔ اس نقطہ نظر کے پیچھے میکس مولر اور

ایڈورڈ بی ٹائلر کے نظریات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ مولر جو بنیادی طور پر آریائی نظریے کا قائل تھا اور اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کا طبقہ اعلیٰ بھی آریائی ہے۔ ہندوستان میں تہذیب کا قیام تو ہوا جسے آریہ نامکمل چھوڑ گئے۔ اب انگریز پلٹ کر اسے دوبارہ عظمت کی راہ پر لانا چاہتے ہیں۔ مولر کی یہ رائے کہ برعظیم کے باسی ماضی میں کبھی عظیم تھے، اکثر مستشرقین کے لیے قابل قبول نہ تھی۔

> "Despite Muller's trumphant claims, there were many even among orientalists who continued to urge the inferiority of Indians in race and culture, vigorous and widespread opposition to Muller Came from two camps described by Trautmannas" race science, theorized the English commonsense view that the Indians, whatever the sanskritsts might say, were a separate, inferior, and unimproveable race."(16)

ٹمپل کا شمار ان فوک لورسٹ میں ہوتا ہے جنہوں نے فوک لور کی تحقیق اور ابتدائی نظری مباحث میں حصہ لیا۔ اس وقت لوک ادب میں لسانیات، تقابلی صنمیات، انسانیات، سائنس اور تاریخ کے حوالے سے تجزیوں کا رجحان پیدا ہو چکا تھا۔ وہ انسانیات کو تو من مرضی کے معنی دے کر ان کا اطلاق پنجابی لوک ادب پر کرتا ہے لیکن تاریخ سے چشم پوشی کرتا ہے۔ اس کے ایک ہم عصر لارنس گوم نے لوک ادب کو 'تاریخی سائنس' قرار دے دیا تھا اور اس کے نظریات نے اس میدان میں تہلکہ مچا دیا۔ ٹمپل، لارنس گوم کی تعریف تو کرتا ہے لیکن اپنے تجزیہ میں اس سے دامن بچا کر نکل جاتا ہے۔

> ''ان حکایات کے تاریخی پہلو کے متعلق کچھ بیان کرنے کا نہ یہ موقعہ ہے نہ وقت، اور ہندوستان میں مناسب لائبریریاں نہ ہونے کے باعث..... اور یہ یہاں کی اہم ضرورت ہے.....ان حکایات کے عام لوک کہانیوں سے تعلقات کے متعلق تحقیقات کو بھی مناسب طریق سے ہاتھ میں نہیں لیا جا سکتا''۔(17)

ظاہر ہے کہ اگر راجا رسالو اور گورکھ ناتھ کی کہانیوں کا تاریخی تجزیہ کیا جاتا تو اس سے عرب حملہ آوروں کے خلاف سورمائی اور دانشورانہ مزاحمت کا نتیجہ نکلنا تھا، جس کی جانب ہلکا سا اشارہ ٹمپل نے کیا ہی ہے۔ گورکھ

ناتھ کے تو کئی اشعار اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ وادی سندھ پر عربوں کا قبضہ مقامی دانشوروں کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ اس زاویے سے تجزیہ کیا جاتا تو قارئین کا اعتماد بحال ہونے کا خدشہ تھا کہ ہمارے آباؤ اجداد بھی سامراجی قوتوں کے خلاف مزاحمت کرتے رہے ہیں۔ اس نے تیسری جلد میں ان کہانیوں کی فہرست دی ہے، جنہیں وہ کتابی شکل میں محفوظ نہیں کر سکا۔ ان میں دُلا بھٹی، جیمل فتا، گورو گوبند سنگھ، رنجیت سنگھ اور ہری سنگھ نلوا کی کہانیاں بھی ہیں۔ یہ کردار وسط ایشیائی سامراج کے خلاف بغاوت کی علامت ہیں۔ اگر یہ قوم ماضی قریب کے سامراج کے خلاف بغاوت کر سکتی ہے تو انگریز سامراج کے خلاف بھی بغاوت کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کے انگریز مستشرقین کی تحقیق کا زاویہ بھی یہی تھا کہ کہیں یہ محکوم دوبارہ سے بغاوت نہ کر دیں اور ایسے احساسات کو 'کنٹرول' کر کے دبانا تھا۔ ٹمپل جب لوک کہانیوں کی تحقیق کر رہا تھا تو اس وقت شاہ محمد کی ''سکھاں دی وار'' اور 1857ء کی جنگ آزادی کے ڈھولے پنجاب کی فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ 'مقتدر سکالر' ٹمپل کے سامنے کوئی بھاٹ یہ شاعری پڑھتا؟ اگر منشیوں کے ذریعے اس تک یہ مواد پہنچ بھی جاتا تو کیا ٹمپل اسے اپنے انتخاب میں شامل کر لیتا؟ اس نے دوسری سامراجی طاقتوں کے خلاف باغیوں کی کہانیاں اکٹھی کر کے شائع نہیں کروائی تھیں انگریزی سامراج کے باغیوں کے بارے میں مواد شائع ہونا تو بعید از قیاس ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ ٹمپل نے 'کولونیل نالج' کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جس سے مقامی لوگوں کے احساسات تک تو پہنچا جا سکے لیکن ان کی حقیقی عظمت کا شائبہ تک نہ ہو۔ نکولس۔ بی۔ ڈرکس نے مستشرقین کے تحقیقی مقاصد کے بارے میں لکھا ہے:

> ".....it also makes clear that the historical anthropology of the colonial state must not be seprated from the historical anthropology of the modern nation state in general. The colonial state is seen as a theatre for state experimentation. When historiography, documentation, certification, and representation were all state modalities that transformed knowledge into power."(18)

انگریز مستشرقین کا مطمع نظر واضح ہے کہ مشرق کے خیالات و افکار کو مسخ کر کے جھوٹا شعور پیدا کیا جائے۔ اس شعور کے پس پردہ ان کے مقاصد چھپے ہوئے تھے کہ 'کولونیل نالج' حاصل کر کے کالونیوں پر قبضہ کیا جائے

اوران کے وسائل کولوٹا جا سکے۔ٹمپل کی 'حکایات پنجاب' کے دیباچے بھی اسی دانش کی کڑی ہیں۔لیکن یہاں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ادب کا معاملہ سماجی علوم سے تھوڑا سا مختلف ہوتا ہے۔ادب کے اندر اتنی وسعت ہوتی ہے کہ وہ آنے والے کل کا ساتھ دے سکتا ہے۔ٹمپل نے لوک ادب کے جن ذخیروں کو اکٹھا کر دیا ہے آنے والے عہد کا نقاد اسے اپنے زاویے سے پڑھ کر مثبت نتائج بھی نکال سکتا ہے۔اگر ٹمپل انیسویں صدی میں یہ متن ترتیب نہ دیتا تو شاید آج ہم اس ورثے سے محروم ہوتے۔اس طرح 'حکایات پنجاب' کے متن کی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔ادبی دُنیا میں ایسے معجزات کا امکان ہمیشہ رہتا ہے کہ کسی بھی جون ڈن کو کوئی بھی ٹی۔ایس۔ایلیٹ مل سکتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1- Dr Mazharulislam, A History of Folktale collections in India Bangladesh and Pakistan( )150.

2۔'دی لیجنڈز آف دی پنجاب، کے حصہ سوم کے دیباچہ کا اصل انگریزی متن پاکستانی کتب خانوں سے نہیں مل سکا۔ بھاشاوبھاگ پٹیالہ نے اس کا دوسرا ایڈیشن1962ء میں شائع کیا تھا وہ بھی میری پہنچ سے باہر تھا۔لوک ورثہ اسلام آباد سے شائع ہونے والے ایڈیشن میں تیسری جلد کا دیباچہ شامل نہیں کیا گیا۔امر پرکاشن دِلی سے1991ء میں شائع ہونے والی'دی لیجنڈز آف دی پنجاب' کا نام تجویز کیا گیا ہے۔اس کے اوپرPopular Legends of India and Pakistan Revised and edited byمہیپ سنگھ لکھا ہوا ہے۔مہیپ سنگھ نے دوسری اور تیسری جلد کے دیباچے شامل نہیں کئے۔ایسی صورت میں مجلس ترقی ادب لاہور کے اردو ترجمہ پر ہی انحصار کرنا پڑا۔

3- Stuart H.Blackburn, A.k.Ramanujan, "Introduction", Another Harmony New Essays on the Folklore of India, ed. Stuart H Blackburn, A.K. Ramanujan (California: Univesity of California Press, 1986)2-3.

4- Stuart Blackburn, Print Folklore, and Nationalism in Colonial South India(Delhi: permanent Black,2003) 31.

5- Dr Mazharulislam 30.

6- Dr Mazharulislam 48.

7- Gloria Goodwin Raheja, "Caste, Colonialism, and the speech of colonized: Entexualization and disciplinary control in India," American Ethnologist 23.3 (1996) 21 May 2009<http://www.jstor.org.>

8۔آر۔سی۔ٹمپل، حکایات پنجاب حصہ اول۔مترجم،میاں عبدالرشید۔(لاہور:مجلس ترقی ادب، 1990ء)11۔

9۔آر۔سی۔ٹمپل،حصہ اول۔12۔

10۔آر۔سی۔ٹمپل،حصہ اول۔12۔

11۔آر۔سی۔ٹمپل،حصہ اول۔11۔

12۔آر۔سی۔ٹمپل،حصہ اول۔8۔

13- Sadhana Naithani, "The Colonizer-Folklorist,"Journal of Folklore Research34.1(1997)
19 May 2009 <http://www.jstor.org>

14۔آر۔سی۔ٹمپل،حصہ اول۔12۔

15۔آر۔سی۔ٹمپل،حصہ اول۔10۔

16- Eric Csapo, Theories of Mythology (Malden: Blackwell, 2005)20.

17۔آر۔سی۔ٹمپل،حصہ اول۔13۔

18- Nicholas B.Dirks, Foreword, Colonialism And Its Forms of Knowledge, by Bernard S.Cohn
(Princeton: Princeton University Press, 1996) xi.